R. N. 2186/57 Regd. No. A 823

انجمن ترقی اردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

Telephone No. 56

Telegrams: "ANJUMAN"

ہماری زبان

[illegible]

جلد ۲۱ شمارہ ۳۴ | ایڈیٹر آل احمد سرور | علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

شہزادی کلثوم کی اردو شاعری

شہزادی کلثوم ریاست کی واحد اردو شاعرہ ہے جو ۱۹۱۸ء میں بے پورمیں پیدا ہوئیں۔ بعد ۱۹۴۱ء میں سپرد خاک ہوئیں۔ اُن کی تالیفات شبیخ حرم، معرکۂ کربلا و شاعرات اور اقبال شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے مندرجہ ذیل مضمون میں شہزادی کلثوم کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

شہزادی کلثوم نے شہر جنوں میں صرف ایک گہری سانس لی ہے، کم سنی کی موت، کسمسکتی چاہت کی موت ہے۔ وہ قصۂ خونِ جگر دیکھ سکیں۔ اُن کی یہ تخلیق، صرف ایک تبسم رنگیں ہے۔ کسی نامکمل مجسمہ کو دیکھتے ہوئے ذہن، ادراک کی مدد سے تکمیل کا احساس دلا دیتا ہے۔ شہزادی کلثوم کے اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے شعور خلش اور اضطراب سے آگاہ بھی کرتا ہے اور طلسم کا نصف خاکہ بھی مرتب کر دیتا ہے۔ یہ "الاپ" ہے استھائی نہیں ہے۔ لیکن "الاپ" سے ہم جانات (Tendencies) استھائی کے پھیلاؤ کو محسوس کرا دیتے ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیں اور نظمیں چند راہوں کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راہیں اور یہ اشارے شہزادی کلثوم کی جذباتی اور داخلی اقدار اور تمناؤں کا حاصل نہیں ہیں۔ مجھے یہ اشارے پسند آئے اور یہ راہیں روشن نظر آئیں۔ جمالیاتی مسرت (Aesthetic Pleasure) کے لئے شہزادی کلثوم کے یہ لمحاتی تجربے قابل غور ہیں۔

ناپرستوں نے حسرت و ارماں مٹا دیئے
کیسا یہ گھر بھرا ہوا ویران ہو گیا

میرا حالِ تباہ سُن لیجیے ؎ یہ حکایت [illegible] حقیقت ہے
اب تک ہے میرے دل میں وہی حسرت آرزو
بھولی نہیں ہوں آپ کی پہلی نظر کو میں
سر اٹھا تھا ابھی نہ سجدے سے
سامنے اُن کا آستانہ تھا
اے غم عشق مانگنے والے! ؎ اک دلِ دردآشنا بھی مانگ!
وہ بلا جس کی موت ہے اے دل! ؎ اس محبت کی انتہا بھی مانگ!
مرنا نہ میرا مرنا، جینا نہ میرا جینا
پھر کیوں گنا رہا ہے کوئی مری خطائیں!

اب حکم ہو تو ختم کروں اس سفر کو میں
طے کر چکی ہوں عرصۂ شام و سحر کو میں
دستِ خزاں میں دیکھ کے گلہائے تر کو میں
کروں نہ چاک دامنِ بادِ سحر کو میں
پردہ میں کائنات کے دھوکہ نہ دیجئے
پہچانتی ہوں خوب فریبِ نظر کو میں

شہزادی کلثوم زندگی کے چلتے ہوئے لمحات سے دور چلی گئیں لیکن اُن کے کلام میں ان کا سایہ موجود ہے۔ پُر اسرار کرب کی آسودگی کی کوشش میں انفرادیت کا نقش جم جاتا ہے۔ اس ادھورے چاند میں جھائیوں کو دیکھ لینا مشکل نہیں ہے۔ کلاسیکل تجربوں کے تصادم میں شدتِ احساس اور جذباتی فکر کا مطالعہ خلاقانہ توانائی اور اقدار کے تحرکات کا مطالعہ ہے۔ روایت، نئے تجربوں کی رومانیت کی زمین بھی ہے۔ نئے ذہنی عوامل اور محرکات، روایت اور کلاسیکیت کے خطرے کے بغیر لازوال شاروں کو جنم نہیں دے سکتے۔ روایت ایک پھیلے ہوئے اور گہرے نظام فکر کا نام ہے۔

اُردو کی روایتی شاعری میں جو کائناتی روح ہے، جو فکری اور جذباتی میلانات اور محرکات ہیں اور اس شاعری سے جو اندرونی زرخیزی ہوئی ہے، ان تمام باتوں کو نظر انداز کرکے اسے "گل وبلبل" کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جدید حقیقت نگاری کے تصور نے فریب نظر، ابلاغ تخئیل، اور جذبات کی گہرائی اور گیرائی کو جس طرح نظر انداز کیا ہے، اس کی مثال آرٹ کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ "حقیقت نگاری" آرٹ کے رموز و علائم کو سمجھ نہ سکی اور بھاگتے لمحوں کے تیز دھاروں سے داخلی اقدار کو بھی تراشنے لگی۔ بات بہت معمولی ہوئی اور وہ یہ کہ منطقی اور استدلالی فکر کے مطابق "زمانہ" کی تراش خراش ہوئی اور جذباتی فکر کے دام سے زمانہ نکل گیا۔ اُردو کی کلاسیکی شاعری مختلف اندازِ فکر (Attitudes) کا آئینہ خانہ ہے۔ طرزِ احساس کا مطالعہ نہیں ہوا ہے ورنہ جمالیات کی وسعت کا اندازہ ضرور ہو جاتا۔ ذوق، وجدان اور جذباتی فکر نے ان گنت فضاؤں کی تشکیل کی ہے۔ تہہ در تہہ داخلیت نے ذہنی زندگی اور شعور و احساس کی اندرونی تاریخ مرتب کی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ نے حقیقتوں کی جذباتی باز آفرینی کی ہے۔ ان تینوں شاعروں نے صدیوں کی روایتوں میں تین علیحدہ روشن میناروں کو نصب کیا ہے۔ ان کے علاوہ چند اور اہم نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان تمام کلاسیکی شعرا نے جن رموز و علائم اور جن اشاروں کی تخلیق کی ہے ان میں ابدیت اور ہمیشگی ہے، درون بینی، شخصیتوں کی حرکتیں، ذہنی کیفیات اور واردات، تخئیل، وجدان اور جذبات کے گہوارے۔ اُردو شاعری کی شعریت میں ان ہی تمام باتوں کا ذکر ہوگا۔ اس شعریت کو داخلی طور پر جذب کئے بغیر کوئی جدید شاعر ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ کلاسیکی اسالیب اور کلاسیکی علامیت اندرونی جذبے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اظہار کی قدر (The value of expression) کا تصور ان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شہزادی کلثوم اس شعریت کے آداب سے واقف ہیں، کلاسیکی روایتوں کی روشنی حاصل کرنا چاہتی ہیں، تجربوں کو تخئیلی اور وجدانی رنگ میں نمایاں کرتے ہوئے "حقیقت" سے زیادہ "شعریت" کا خیال رکھتی ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی فکر اور وجدان نے انھیں زیادہ متاثر کیا ہے، کم سن ذہن کو خصوصاً اقبالؔ کے جذباتی اور ذہنی نظام سے جو روشنی ملی ہے اسے "حکیمانہ نکات" اور "انقلاب اندر شعور" کے پس منظر میں دیکھنا یقیناً ظلم ہوگا۔ ہاں، یہ ضرور دیکھئے کہ اس کم سن اور معصوم نظر کو جو بصیرت ملی ہے اس سے کتنے نازک، لطیف اور گہرے اشارے پیدا ہوئے ہیں اور رومانی رُجحان (Romantic attitude) کس طرح اُبھرا ہے۔ شہزادی کلثوم کا رومانی اور جمالیاتی رجحان ایہام کے پیکر نہیں تراشتا، نئی اجنبی تشبیہوں کی تخلیق بھی نہیں کرتا، اسے فلسفہ اور منطق سے بھی دلچسپی نہیں ہے، اس عمر میں یہ سب کچھ ممکن بھی نہ تھا۔ اس رُجحان میں روایت اور جدت کا احساس ہے، تہذیبی اور تمدنی اقدار اور تصورات سے دلچسپی ہے، تخئیلی ہیئت کو کچے اور پختہ تجربوں اور جذبوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ اس رجحان میں ایک روح مضطرب اور بے چین نظر آتی ہے، خلش و تپش، شوق و آرزو، تلاش و جستجو، حیرت اور بے خودی، امید اور اعتماد، وصل اور ضبط۔ ایک دائرے میں اُن کے چھوٹے چھوٹے کئی دائرے ملتے ہیں :-

کعبہ نہیں، کلیسا نہیں، دیر بھی نہیں
پھر کیا سمجھ رہی ہوں تری رہگذر کو میں؟
تعبیر اس کی حشر ہے کس کو خیال تھا؟
اتنا اہم نہ سمجھی تھی خوابِ سفر کو میں!
ٹھہری ہے لامکاں سے گزر کر مری نگاہ!
اب تو بتا کہ کیا کہوں حدِ نظر کو میں؟

خارِ گل ہی میں اُلجھ کر رہ گئی میری نظر
کب یہ ہم آہنگیِ سود و زیاں سمجھی تھی میں!
اب جو دیکھا خود مری ہستی ہی پردہ دار ہے
تابشِ تنویر ہی کو درمیاں سمجھی تھی میں!
حاصلِ کون و مکاں ہے ربط و ضبطِ حسن و عشق
یہ حسابِ دوستاں در دل کہاں سمجھی تھی میں؟
جو سمجھ کے پا شکستہ مجھے کارواں نے چھوڑا
تو لپٹ لپٹ کے روئی ہیں غبارِ کارواں سے
ترے حُسن کی حقیقت مرے عشق میں ہے مضمر
مرا دل بھی کم نہیں ہے تری بزمِ لامکاں سے!
اے عقل دور ہاش کہ ہے منزلِ شہود
آئینۂ خیال کو حیراں کئے ہوئے
ششی ہے آج عہدِ گلستاں کی یادگار
ہر شاخِ گل ہے برق کو مہماں کئے ہوئے
ہر قطرہ ہے تلاطمِ دریا کی یادگار
ہر ذرہ ہے نمودِ بیاباں لئے ہوئے
اللہ رے دعائے لبِ زخم کا اثر
وہ خود ہی آ رہے ہیں نمکداں لئے ہوئے
کھو تھی تیری یاد میں کلثوم
موت کب آ گئی، خدا جانے!

(باقی صفحہ ۸ پر)

چند دوہے

[illegible]

ہماری زبان

۸ ستمبر ۱۹۶۲ء

یو.پی لسانی کمیٹی کی سفارشات

معاصر قومی آواز نے یو.پی لسانی کمیٹی کی سفارشات کا خلاصہ شائع کیا ہے۔ یہ کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ ریاستی حکومت نے نظم ونسق کے امور میں اُردو کے استعمال کے بارے میں جو ہدایات جاری کی ہیں ان پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے، لسانی اقلیتوں کو دستور میں جو تحفظات دئے گئے ہیں اُن کی کس حد تک پابندی کی جا رہی ہے اور اُردو کو فروغ دینے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔

یہ کمیٹی اپریل سنہ ۱۹۶۱ء میں بنائی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء تک یہ اپنی سفارشات پیش کر دے۔ اب خدا خدا کر کے ستمبر میں یہ کام پورا ہوا ہے۔ کمیٹی کے ایک ممبر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک نشست کے بعد ہی استعفا دے دیا کیونکہ ان کے پاس اس کام کے لئے وقت نہ تھا۔ ایک دوسرے ممبر مولانا حفظ الرحمٰن صرف چند جلسوں میں شریک ہو سکے۔ پھر وہ بیمار ہو گئے، یہاں تک کہ آخر ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے ممبروں کی کوششوں کا نتیجہ اگرچہ پورے طور پر ابھی عوام کے سامنے نہیں آیا، مگر خلاصے کی بنا پر کچھ رائے تو دی ہی جا سکتی ہے۔ ہماری رائے میں اس کمیٹی کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ اس نے کما حقہٗ انجام نہیں دیا۔ اس نے صرف چند لوگوں کے بیانات لئے، حالانکہ سوالنامے پر جن لوگوں نے اظہار خیال کیا تھا، اُن سب کا بیان لینا ضروری تھا۔ کمیٹی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اُن ابتدائی مدرسوں کی تعداد جن میں اُردو ذریعہ تعلیم ہے، اُردو والوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کیوں کم ہے اور کیا وجہ ہے کہ کئی بار باوجود چالیس سے زیادہ طلبہ یا اُن کے سرپرستوں کی درخواست کے اُردو کے اسکول نہیں کھولے گئے ہیں۔ کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ وہ دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف کے مطابق یہ دیکھے کہ آیا ریاستی حکومت نے اپنے مقدور کے مطابق لسانی اقلیت کے طلبہ کو اُن کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔ اگر کی ہے تو اس کوشش کی تفصیلات عوام کے سامنے آنی چاہئیں، اور اگر نہیں کی ہے تو جن لوگوں سے کوتاہی ہوئی ہے اُن سے باز پرس کرنی چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ نظم ونسق میں اُردو کے استعمال کے لئے کچھ سہولتیں ملی ہیں اور عدالتوں اور دفتروں میں اُردو رسم خط میں درخواستیں دینے اور کاغذات پیش کرنے کی حکومت نے اجازت دی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کارکن دقتیں پیدا کرتے ہیں یا نہیں، یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی۔ افسروں کی شہادت اس سلسلے میں کافی نہیں ہے، عوام کی شہادت کی ضرورت ہے۔ اہم قوانین، ضابطوں اور قاعدوں کا خلاصہ اب تک زیادہ تر شائع ہوتا ہے، قوانین کا خلاصہ شائع کرنا محض خانہ پُری کی بات ہے، اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ نیا دور کے پڑھنے والوں کا طبقہ قوانین، ضابطوں اور قاعدوں کے مطالعے کے لئے یہ رسالہ نہیں پڑھتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ قوانین، قاعدے اور ضابطے پورے پورے اُردو میں شائع کئے جائیں اور عوام تک پہنچیں۔ کمیٹی نے یہ نہ معلوم کس طرح کہہ دیا کہ اس بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ جو مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔ پورے متن کو شائع کر کے عام کرنے اور خلاصے ایک رسالے میں شائع کرنے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

کمیٹی نے نہایت بے دردی سے ایک مسلّم تعلیمی اصول کو یہ کہہ کر پامال کر دیا کہ ریاست میں ثانوی درجوں کے ذریعۂ تعلیم کے بارے میں موجودہ ڈھانچے میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں اور علاقائی زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم رہنا چاہیے۔ مادری زبان کو ثانوی درجے تک ذریعۂ تعلیم بنانے کے اصول سے تو سبھی اتفاق کر چکے ہیں۔ کمیٹی کو کم سے کم یہ تو کہنا چاہیے تھا کہ اگر ثانوی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے کچھ ادارے قائم کئے جائیں تو حکومت انھیں پوری امداد دے، اور علاقائی زبان اگر ذریعۂ تعلیم ہو تو جن لوگوں کی مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہے، اُن کو لازمی مضمون کے طور پر مادری زبان بھی پڑھائی جائے۔

کمیٹی کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ زبان کے دونوں اسالیب ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جائیں کہ اُردو بولنے والے ہندی بھی سمجھ سکیں اور بول بھی سکیں، اور اسی طرح ہندی بولنے والے اُردو سمجھ اور بول سکیں۔ یہ بڑا مبارک خیال ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں، مگر اس کمیٹی نے اُردو کے فروغ کے لئے کوئی عملی تجویز تو پیش نہیں کی، ہاں مشورہ دینا کافی سمجھا۔ اُردو کو ایک زبان کی حیثیت سے دستور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ہے۔ حکومت ہند اور حکومت یو.پی کے اعلانات میں بھی اس کی اس حیثیت کو مانا گیا ہے۔ کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ جہاں اس نے ثانوی اسکولوں میں اُردو کی کتابوں کی زبان کو بول چال سے قریب لانے کا مشورہ دیا ہے اور ہندی کے لئے بھی یہی اصول لاگو کرنے کی بات اپنی انصاف پسندی کو ثابت کرنے کے لئے جوڑ دی ہے، وہاں یہ بھی کہتی کہ اب تک ابتدائی اور ثانوی درجوں میں ہندی ادب کے ساتھ اُردو ادب کے نمونے بھی شامل کئے جائیں تاکہ تمام معیاری ادبی اسالیب طلبہ کے سامنے آ سکیں۔ ہمارا تو یہ

خیال ہے کہ اب بھی اُردو کی درسی کتابیں ہندی کی درسی کتابوں کے مقابلے میں بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔

کمیٹی نے مکتبوں کی معیار بندی کی جو سفارش کی ہے وہ اچھی ہے مگر لوکل بورڈوں کو نصاب منظور کرنے کا اختیار دینے کی بات غلط ہے۔ اس کام کے لئے حکومت کو ایک علیحدہ ادارہ بنانا چاہئے جس میں اُردو کے ماہرین کی مناسب اور فیصلہ کُن تعداد ہو۔ صرف اسلامیہ اسکولوں کو اُردو میڈیم اسکول قرار دینے کی بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اُردو میڈیم اسکول اسلامیہ اسکول بھی ہوسکتے ہیں اور دوسرے اسکول بھی۔ اگر کچھ ہندو یا سکھ اپنے اسکول قایم کرنا چاہتے ہیں اور ان میں اُردو کے ذریعے سے تعلیم دینا چاہتے ہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اُن کے نام کو بدلے بغیر انھیں سہولتیں دے۔ مکتبوں اور اسلامیہ مدارس میں تو اُردو میں تعلیم ہوتی ہی ہے، انھیں اُردو میڈیم اسکول قرار دے کر کمیٹی نے کیا تیر مارا ہے؟

ابتدائی کتابوں کی زبان کے متعلق کمیٹی کی سفارش سے ہمیں اتفاق ہے۔ یہ زبان واقعی بنیادی زبان ہونی چاہئے جسے اُردو بولنے والے اور ہندی بولنے والے دونوں سمجھ سکیں، مگر یہاں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ آسان زبان کے چکر میں صرف ہندی کی بحروں کو لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے بلکہ اُردو کی بحروں کی بھی مناسب نمایندگی ہونی چاہئے۔ یہ علیحدگی پسندی کی بات نہیں ہے، زبان کے معیار اور اسلوب کا تقاضا ہے۔

مزید تفصیلات معلوم ہونے پر ہم اس رپورٹ پر تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔ خلاصے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ مہینے کے غور و خوض کے بعد کمیٹی نے جو سفارشات کی ہیں وہ مایوس کُن ہیں۔ ان سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا، نہ اُردو کے فروغ کے لئے واقعی کوئی راستہ کُھلتا ہے۔ در اصل اُتر پردیش کی اکثریت کو یار لوگوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی خاطر بہکا دیا ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اُردو کو سہولتیں دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہندی کو اس کے بلند درجے سے گرا دیا جائے۔ اس لئے اُردو کا نام آتا ہے تو ہندی والے بدک جاتے ہیں۔ ہمارا کام اس اکثریت کے جالوں کو دور کرنا ہے۔ ہندی کی جو پوزیشن اتر پردیش میں ہے اُسے ہم تسلیم کرتے ہیں اور اس میں کوئی اگر مگر نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ اُردو جیسی قومی زبان کو جو اتر پردیش میں ایک مخصوص اہمیت کی مالک ہے اُس کا جائز حق دیا جائے، یہ حق ہمیں لینا ہے۔ اس سے کم پر ہم کسی حال میں راضی نہیں ہو سکتے۔ ہمیں یقین ہے کہ جیسے جیسے حقایق کا احساس بڑھتا جائے گا، یہ حق بھی مسلّم ہوتا جائے گا۔

یو۔پی کی حکومت کو لسانی پالیسی کے نفاذ کے معاملے میں چوکنا رہنا چاہئے

کرپلانی لسانی کمیٹی کی سفارشات

معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ ۱۵ شخصی یو۔پی لسانی کمیٹی نے جس کے چیرمین اچاریہ کرپلانی ہیں۔ مجموعی طور پر ریاستی حکومت کی لسانی پالیسیوں کو پسند کرتے ہوئے اُردو کو فروغ دینے کے لئے دور رس اصلاحیں تجویز کی ہیں۔ ساتھ ہی حکومت کو خبردار کیا ہے کہ ان کے نفاذ کے سلسلے میں اسے ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے۔

اُردو کی تعلیم: اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں کمیٹی نے تین اہم سفارشات کی ہیں پہلی سفارش مکتبوں کی معیار بندی کرنے اور ان کو معقول امداد دینے کے متعلق ہے بشرطیکہ وہ ان قاعدوں پر عمل کریں جو ان کی حالت سدھارنے کے لئے وقتاً فوقتاً وضع کئے جائیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان مکتبوں کا کریکولم لوکل بورڈوں کا منظور کیا ہوا ہونا چاہئے اور لوکل بورڈوں کو چاہئے کہ ان مکتبوں کو تسلیم کرنے اور مدد دینے کی شرطیں واضح طور پر متعین کر دیں۔ جو مکتب تسلیم کئے جائیں ان میں بورڈ وہی مدرس طالب علم تناسب مقرر کرے جو جونیر بیسک اسکولوں میں مقرر کیا گیا ہو۔ رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ لوکل بورڈوں کو مدرسوں کے لئے ضروری کوالی فیکیشن اور تنخواہ کا اسکیل مقرر کر دینا چاہئے۔

عربی فارسی مدارس: عربی فارسی مدارس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان مدرسوں کے ابتدائی درجات میں غیر عربی فارسی کریکولم درس ہونا چاہئے جو مکتبوں کا ہونا چاہئے۔ ان مدرسوں کے ابتدائی درجات میں بیسک اسکولوں کی نظر ثانی شدہ درسی کتابیں پڑھائی جانا چاہئیں۔

اسلامیہ اسکول: اسلامیہ اسکولوں کے سلسلے میں کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ "بدلے ہوئے حالات میں" ان اسکولوں کا نام "اُردو میڈیم اسکول" (اُردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے اسکول) ہو جانا چاہئے اور مختلف لوکل بورڈوں کی ماتحتی میں ان کی جو تعداد ہے وہ کسی معقول سبب کے بغیر گھٹائی نہیں جانا چاہئے۔

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ تعلیم کے منطقائی ڈپٹی ڈائرکٹروں سے جو ڈپٹی انسپکٹر آف محمڈن اسکولس وابستہ ہیں ان کو "ڈپٹی انسپکٹر آف اُردو میڈیم اسکولس" کہا جائے۔

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ اُردو میڈیم اسکولوں میں ایک خاص فرقے کے ٹیچروں کی تقرری کی پابندی ہٹا دی جائے کیوں کہ یہ پابندیاں محض حکومت برطانیہ کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کی یادگار ہیں۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

"عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا"

علی گڑھ میں ایک بزم بے تکلف ہے جس کی اب تک صرف تین نشستیں ہوئی ہیں۔ پہلی نشست ڈاکٹر خورشید صاحب کے یہاں ہوئی تھی دوسری مجنوں گورکھپوری صاحب کے یہاں ہوئی اور تیسری نشست آل احمد سرور صاحب کے یہاں ہوئی۔

دوسری نشست میں طے پایا کہ ایک مصرعہ طرح بھی دیا جائے جو صاحب چاہیں اس پر طبع آزمائی فرمائیں چنانچہ غالب کا مندرجہ بالا مصرعہ مصرع طرح قرار پایا اور آخری نشست میں ڈاکٹر خورشید، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، شہاب جعفری، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، قاضی عبدالستار، شمیم حنفی اور شہریار نے طرحی غزلیں سنائیں۔ طرحی غزلوں کا انتخاب ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

وحید اختر

ہم کی خاطر ہم نے دنیا کو نہ جانا آشنا
ہر کسی کا ہو کے بھی جس کا نہیں کوئی نہیں
مصلحت کی ہے سبب چلیے تو کیا عالم ہو ساتھ
کچھ غم دنیا بھی ان کے غم سے ملتا ہے ضرور
کیا کوئی جھگڑا نہیں ہے زندگانی سے جیسے

اب بھی نا آشنا اور ہماری دنیا آشنا
کو ہے جو شب آوارہ اس کا آشنا
راز خود رفتگی ہے قافلہ آشنا
یہ دل ویرانہ ہے ورنہ کس کا آشنا
یا جنوں بھی ہو گیا ہے مصلحت کا آشنا

معدوم میں خدا آشنا تھی

کوئی ہے جو آشنا کوئی ہے دنیا آشنا
چپ ہے کیسا زباں کھولیں تو کس کے سامنے
دامن دریا بھی ہے ایک آنسو کے بغیر
دوستو کس سے کریں ہم ہوا جو جستجو کی آب
عشق کہتا ہے کہ ہم کو جان دینے سے غرض

کوئی دیوانہ نہیں صحرا میں صحرا آشنا
کاش مل جاتا ہمیں کوئی یہاں نا آشنا
کوئی طوفاں ہی یہاں آجائے قطرہ آشنا
خیر ہو نکلا یہاں پر اک دنیا کا آشنا
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

قاضی عبدالستار

گردش ایام کیا ہے گردش افلاک تک
آنکھ قاتل آنکھ بیگانہ کی بیگانہ رہی
اب کوئی عزلت نشیں ہے اور صحرا آشنا
اب کلیم کرتی ہے ساری کے سب کی تن
ہم کو آداب ہی نہ اٹھا کر لے چلے

پاؤں میں پہنچا کرتا ہے تیرا آشنا
اور وہ کمبخت ہے جو آشنا کا آشنا
عافیت نے ڈس لیا ہے کیسا کیسا آشنا
اور مرتے جاتے ہیں بیمار عیسیٰ آشنا
ورنہ اپنی آستیں کا نم ہے دریا آشنا

شہاب جعفری

دیکھیں کب اس راز سے ہوتی ہے دنیا آشنا
سب چھپے ہیں اپنے اپنے دل کا چور
ہم بھی اپنی سے ہم بھی ہنستے ہو لیے
میکدے ہو شب نا آشنا جیسے آشنا نہیں
مجھ سے یوں ہو زندگی کا ہر تقاضا ہر سوال
ڈالتی ہے زندگی پچھلی بہاروں پر نظر
بوئے گل سے جیسے ہے یہ بادہ بہاری کا سکوں
دشمن جاں ہیں کس منہ سے کہتے ہو شہاب

آشنا وہ ہے جو ہو ہر اجنبی کا آشنا
جس کو دیکھو غیر ہے یہاں اور پیدا آشنا
اس بھری محفل میں لیکن کون کس کا آشنا
جھوٹی سچی پیاس کی ہوتی ہو صہبا آشنا
جیسے میں ہی رہ گیا ہوں ایک تنہا آشنا
ڈوبتے تاروں سے ہو جیسے سویرا آشنا
جیسے ہو جائے سدا کا آشنا نا آشنا
دوست ہیں سب خدائی کے خدا آشنا

شمیم حنفی

ہر گلی کس طرح ہے تاراج یادوں کا چمن
کیوں نہ شہر دل کی کوچے بھر آئے ہیں
کیوں در و دیوار سے آنسو نکلیں ہیں جیسے

اٹھ گیا کس واسطے شہر تمنا آشنا
کرتے پھرتے رہے صحرا بہ صحرا آشنا
ایک ذرا آنکھوں نے کوئی خواب دیکھا آشنا

خلیل الرحمن اعظمی

یوں تو سب پہچانتے ہیں سب ہیں ہم سا آشنا
لذت زہر والت سے جو ہو گا آشنا
عشق کی اک عمر آوارہ مزاجی میں کٹی
گردشیں دوراں اوھر آنکھ بیٹھے رہے
آج آئینے میں ہم یوں دیر تک دیکھا کیے
دل کا جانا ٹھہر جائے تو ہمیں بھی چین ہو
اک ذرا سی بات کی پرسش اور اک عمر کی خلش
زندگی بھر اب تو اپنی آگ میں جلتے رہو

میکدہ اس کا ہے جو ہے میکدے کا آشنا
اس بھری محفل میں ہو گا میرا تنہا آشنا
لمحہ لمحہ اجنبی تھا لمحہ لمحہ آشنا
دہر میں ہم نے نہ پایا کوئی تجھ سا آشنا
جیسے مل جائے کہیں کوئی کبھی کا آشنا
کچھ نہیں کہتا کہ آخر کون کس کا آشنا
تو جوانی ڈھونڈ لیتی ہے خود اپنا آشنا
اے خلیل اعظمی اے روح شعلہ آشنا

آل احمد سرور

سلسلہ بیگانگی کا آشنا نا آشنا
آج دریاؤں میں بھی خاصی تشنگی ہے جام
یا حیات نو ہے معصوم کلیوں کا حجاب
ان بڑے شہروں میں انسانوں کی تنہائی نہ پوچھ
ہم نفس چاہیے اس شوق اور راز جنوں
ساتھ رہنا وقت کا بھی یاں حیات جاوداں
جس کی بیگانہ روش کی ہم قسم کھاتے ہیں
رو رہے ہیں درد کا محرم کوئی کیا ہو گا

آج دنیا میں نہیں کوئی کسی کا آشنا
اب کہاں وہ قطرہ کہیے جس کو دریا آشنا
پاکشو دکار سے باد صبا نا آشنا
کس قدر آباد اور کس درجہ صحرا آشنا
ہم نشیں پائے ہوس ہیں یہ وفا نا آشنا
کل تلک جو آشنا تھے آج ہیں نا آشنا
در بدر کی میں وہ نکلا ہمارا آشنا
آج تک جب کہ سکا انساں نہ اپنا آشنا

مجنوں گورکھپوری

"سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا"
کس کو سمجھوں آشنا کس کو کہوں نا آشنا
حسن وحشت خصلت و ہم فطرت و بیگانہ خو
دہر میں دل آشنائی دشمن جاں دوستی
اپنا اپنا ہے مقدر اپنا اپنا ہے مقام
وصل کی حسرت رہی باقی نہ فرقت کا ملال
عشق کیا ہے اپنے ذوق کی تسکیں ہے
ہر تو اپنی پیاس کے ماتے ہیں ہم کو کیا غرض
وادی سینا کلیسا حرم دار و رسن
کار فرما ہے وہ عالم جذبۂ شوق و طلب

کوئی بھی گلشن میں ہے اے گلشن آرا آشنا؟
آشنائی جستجو میں ہوں سبکا آشنا
عشق وارفتہ طبیعت ہے تجاہل آشنا
میں سبھی کا دوست لیکن کون میرا آشنا
تم مرے نا آشنا ہو میں تمہارا آشنا
ہو چلا ہے تیرا دیوانہ کچھ اپنا آشنا
کوہ کن جادہ تراش و قیس صحرا آشنا
شبنم آلودہ ہو کوئی، کوئی دریا آشنا
ایسی کتنی منزلیں ہیں آشنا نا آشنا
گردش مجنوں ہے جس کی اے لیلیٰ آشنا

جگن ناتھ آزاد

عدن جاتے ہوئے راستے میں عدن جب پہنچے
تو یہ قطعہ موزوں ہوا جو ناظرین ہماری زبان کی
خدمت میں حاضر ہے۔

عدن کی شام

یہ ساحل عرب پہ نظارہ غروب کا
کتنی نظر نواز ہے لعل عدن کی شام
اس شام کا اگرچہ نہیں ہے کہیں جواب
کیوں یاد آگئی ہے نہ جانے وطن کی شام

(از لندن)

مراسلات

مول چند منشی کا شاہنامۂ اردو

(۱) یکم اگست ۶۲ء کے اخبار ہماری زبان میں جناب قاضی معراج دھولپوری کا ایک مضمون شایع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے "مول چند منشی کا شاہنامۂ اردو"۔ اس مضمون میں موصوف نے لکھا ہے:-

"۱۸۵۴ء میں خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو کی جانب سے شایع ہوا ہے، اس میں صفحہ ۴۰۷ کے فٹ نوٹ میں شاہنامۂ زیر بحث کا نام 'خسروان عجم' بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے بشمول لفظ 'قصہ' مادہ تاریخ ہے۔ نام اس کا شاہنامۂ اردو ہے جو کتاب کے سرورق پر مطابق دستور صرف تحریر میں لایا گیا ہے۔"

قاضی صاحب کے پیش نظر اس کتاب کا صرف وہ نسخہ ہے جو مطبع درخشانی میں ۱۲۹۰ھ میں چھپا تھا اور ان کا یہ بیان اسی نسخے کے سرورق پر مبنی ہے۔ راقم کے کتب خانے میں اس کتاب کے پانچ مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ چار نسخوں کے مطابع اور سنین طباعت حسب ذیل ہیں:-

مطبع مصطفائی، کانپور، ۱۲۷۰ھ — مطبع مرتضوی، لکھنؤ، ۱۲۷۳ھ

مطبع حسنی، لکھنؤ، ۱۲۷۳ھ — مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۲۷۴ھ

ان چاروں نسخوں کے سرورق پر کتاب کا نام "شاہنامۂ اردو" لکھا گیا ہے، لیکن ایک نسخہ جو ان سب سے قدیم تر ہے اور جس کو نستعلیق ٹائپ میں مطبع علوی، ہگلی نے ۱۲۶۲ھ میں چھاپا تھا، اس میں کتاب اور اس کے مصنف کا نام یوں لکھا گیا ہے:-

"یہ منظوم موسوم بہ 'قصۂ خسروان عجم' ترجمہ تمام شاہنامے کا ہے بطور اختصار کے اردو زبان میں، نام مترجم کا مول چند لکھنوی اور تخلص اس کا منشی ہے۔"

اس نسخے میں فہرست مضامین پر یہ عنوان درج ہے "فہرست قصۂ خسروان عجم"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا نام "قصۂ خسروان عجم" رکھا تھا، جس سے اس کا سال تصنیف بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ "شاہنامۂ اردو" کے نام مشہور ہوئی، جیسا بہت سی کتابوں کے معاملے میں ہوتا رہا ہے۔ تاریخ وصاف، تاریخ بناکتی، اخلاق جلالی وغیرہ کے نام مثال میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ زیر بحث کتاب کا نام مصنف نے "قصۂ خسروان عجم" رکھا تھا اور وہ اس نام سے شایع بھی ہو چکی ہے تو اس کا نام "خسروان عجم" بتانا کوئی بڑی غلطی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ گارساں دتاسی کا اصل خطبہ پیش نظر نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کتاب کے نام میں سے لفظ "قصہ" حذف کر دینے کا ذمہ دار مصنف ہے یا مترجم۔

قاضی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں رجب علی بیگ سرور کے ترجمہ شمشیر خانی مسمّیٰ بہ "سرور سلطانی" کے بارے میں لکھا ہے:-

"۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں یہ پہلی بار مطبع نولکشور میں چھپا ہے ۔۔۔ کے ایڈیشن میں مالک مطبع نے مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی آخر میں شامل کرائی ہے۔"

یہ عبارت تین باتیں بتاتی ہے۔ ایک بات یہ کہ "سرور سلطانی" کو پہلی مرتبہ نول کشور پریس نے ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں چھاپا۔ اس سے پہلے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ ۱۸۸۶ء/۱۳۰۵ھ کے ایڈیشن میں پہلی بار کتاب کے آخر میں مشکل لفظوں کی فرہنگ شامل کی گئی۔ تیسری بات یہ کہ یہ فرہنگ منشی نولکشور نے تیار کروائی تھی۔ لیکن یہ تینوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ میرے کتب خانے میں سرور سلطانی کا وہ ایڈیشن موجود ہے جو واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں لکھنؤ کے شاہی مطبع میں چھپا تھا۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے:-

"سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی در بیت السلطنت لکھنؤ مطبع سلطانی بجہان فشانی و عرق ریزی محمد حسین منطبع شد۔"

یہ غالباً سرور سلطانی کا پہلا ایڈیشن ہے اور ان دونوں ایڈیشنوں سے قدیم تر ہے جن کا ذکر قاضی صاحب نے کیا ہے۔ اس کے آخر میں بھی مشکل الفاظ کی فرہنگ شامل ہے۔ (سید مسعود حسن رضوی ادیب)

(۲) ہماری زبان کے یکم اگست ۱۹۶۲ء کے شمارے میں جناب قاضی معراج صاحب دھولپوری کا ایک مضمون بعنوان "مول چند منشی کا اردو شاہنامہ" شایع ہوا ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ مول چند منشی نے "توکل" نامی ایک "مرد سخن" کے "خلاصہ شاہنامہ شمشیر خانی" کو سامنے رکھ کر ۱۲۴۵ھ میں قصۂ خسروان عجم۔ شاہنامہ کے نام سے اردو نظم میں ترتیب دیا۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ شمشیر خانی کا ایک نسخہ "خلاصہ شاہنامہ"[1] ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

"توکل بیگ"۔ "واقعہ نویس" اور "امین غزنین" نے حاکم غزنین شمشیر خاں کی فرمائش پر فردوسی کے شاہنامہ کا خلاصہ فارسی نثر میں کیا۔ جو تاریخ شمشیر خانی کے نام سے موسوم ہے۔

(تذکرۂ مخطوطات جلد دوم ص ۱۱۲)

قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ گارسن دتاسی نے ۱۸۵۴ء کے خطبہ میں شمشیر خانی کے منظوم ترجمہ اور محمد علی ترمذی اور رجب علی بیگ سرور کے دو نثری تراجم کا ذکر کیا ہے۔

دتاسی نے میرٹھ سے شایع شدہ دیدہ زیب تصاویر سے آراستہ شاہنامہ کے ایک نئے اردو ایڈیشن کی ۱۸۷۳ء کے مقالے میں نشان دہی کی ہے۔ (مقالات اول ص ۳۲۹)

گمان غالب ہے کہ یہ منشی کے شاہنامہ کا دوسرا ایڈیشن ہوگا۔ جس کی مناسب قیمت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] فردوسی نے اپنی تصنیف کو شاہنامہ کے نام سے یاد نہیں کیا، وہ اسے دفتر پہلوی، نامۂ پہلوی، نامۂ خسروان، نامۂ شہریاران پیش، نامۂ باستان وغیرہ کہتا ہے۔ غالباً اسدی طوسی نے اسے سب سے پہلے شاہنامہ کہا۔

بشہنامہ فردوسی نغز گوے / چو از پیش گویندگان برد گوے

(فردوسی پر چار مقالے، شیرانی ص ۳۰)

فردوسی اور ہجو محمود: — عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ
(۱) سلطان محمود نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی[1]
(۲) محمود نے فی بیت ایک دینار دینے کا وعدہ کیا اور تکمیل شاہنامہ کے بعد دینار کے بدلے درم دیئے[2]
(۳) صلے سے محرومی کی وجہ سے فردوسی نے سلطان کی ہجو لکھی۔

فردوسی کے کلام کے اندرونی شواہد بتلاتے ہیں کہ
۱۔ شاہنامہ کی محرک داستان بیژن ہے[3]
۲۔ محمود کی تخت نشینی (۳۸۷ھ) سے بیس سال قبل فردوسی نے شاہنامہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

سخن را نگہ داشتم سال بیست
بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

۳۔ فردوسی نے دقیقی کی خسروان عجم کی نامکمل داستان کو "سست نظم کے نادرست اشعار" کہتے ہوئے شاہنامہ میں شامل کر لیا۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے۔ ع[4]

ہم او بود گوینده را راہبر

۴۔ دفتر باستان۔ نامۂ خسروان یا دفتر پہلوی کی تلاش میں فردوسی سرگرداں رہا۔ مختلف اشخاص اور ذرائع اور اکثر مقامات سے اس نے معلومات فراہم کیں۔

بہ پرسیدم از ہر کسے بے شمار
بہ ترسیدم از گردش روزگار

۵۔ فردوسی کے ایک "مہربان دوست" سے اسے یہ نسخہ مل گیا[5] اور منصور بن محمد کی تحسین و ترغیب پر فردوسی نے اس کام کو شروع کیا۔ (شعر العجم اول صفحہ ۱۰۹)

فارسی ادبیات میں ہجو کو زبردست شہرت حاصل ہو گئی ہے اس کے اولین ناقل بائسنغر مرزا اور نظامی عروضی ہیں۔ بقول شبلی "جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے" (شعر العجم جلد اول ص ۱۰۶)

ہجو کی زبان و طرز بیان، اس کی بے ربطی، بندش کی کمزوری۔ عربی الفاظ کی گراں باری، غیر مانوس تراکیب وغیرہ اس کی مصنوعیت کے قوی شواہد ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہجو تراشوں نے کچھ اشعار وضع کئے، کچھ شاہنامے سے لئے اور مدح کی صورت بدل کر ہجو کا ایک ڈھانچہ تیار کیا جس میں ہر دور میں اضافے ہوتے رہے اور جو سعدی کے زمانہ تک مکمل ہوا اس طرح نظامی عروضی کے نقل کردہ چھ اشعار کی تعداد دو سو سے زائد اشعار تک پہنچ گئی۔ (فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۱۹)

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ فردوسی نے ہجو لکھی تو وہ خود ضائع ہو گئی۔

ہجو قرون وسطیٰ کے افسانہ سازوں کے دماغ کی اختراع ہے۔ فردوسی کی عالی ظرفی۔ اس کی بلند حوصلگی اس کا استغنا۔ شاہنامے کے اکثر مقامات پر محمود کی تعریف و توصیف سے ظاہر ہے کہ اس کا متین اور سنجیدہ قلم ہجو کی سوقیانہ زبان استعمال نہیں کر سکتا۔

سلطان محمود کی مدح میں اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:—

جہاں دار محمود شاہ بزرگ   بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ
چو کودک لب از شیر مادر بشست   ز گہوارہ محمود گوید نخست
بتن زندہ پیل و بجاں جبرئیل   بکف ابر بہمن، بدل رود نیل[1]

فردوسی کے آخری ابیات:—

سی و پنج سال از سرائے سپنج   بسے رنج بردم بامید گنج
چو بر باد دادند رنج مرا   بند حاصلے سی و پنج مرا
کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد   امیدم بیکبارہ برباد شد[2]

اس کی مایوسی اور حرماں نصیبی کو ظاہر کرتے ہیں مگر اس کے جذبات میں وہ تلخی نہیں۔ ان میں رنجیدگی کے وہ آثار نہیں جو شاعر کو ہجو گوئی پر مائل کر دیں۔

وہ محمود کے حق میں یوں دعا گو ہے:—

تن شاہ محمود آباد باد   ہمیشہ بکام دلش شاد باد[3]
چنانش ستودم کہ اندر جہاں
سخن ماند از و آشکار و نہاں[4]

(ادیب برن پوری)

---

[1] یہ خیال ہجو کے اشعار پر مبنی ہے۔
[2] "مگر یہ غلط ہے" شعر العجم اول صفحہ ۱۰۱
[3] مولانا شبلی کے یہ الفاظ کہ "سلطان محمود کی ہجو میں کس حد تک اصلیت کا پہلو ہو گا" قابل غور ہیں۔ شعر العجم اول صفحہ ۱۰۲
[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ فردوسی پر چار مقالے۔ پروفیسر شیرانی۔ اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر ایران کے فاضل ادیب و نقاد سعید نفیسی نے ... کے فارسی ترجمہ کی خواہش ظاہر کی ہے۔
(لباب الالباب۔ محشی سعید نفیسی ص ۷۶۹)
آقائے بہار کا خیال ہے کہ فرزند شعوبیہ کی تحریک پر فردوسی نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا۔ فردوسی و ابو علی سیجور۔ ص ۴۴
[5] لباب الالباب محشی سعید نفیسی صفحہ ۲۹۱/ فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۱۹
تگ کردم ایں نظم سست آمدم   ہمہ بیت ہا نادرست آمدم
شعر العجم اول صفحہ ۲۶
[6] بشہرم یکے مہرباں دوست بود   تو گفتی کہ با من بیک پوست بود
(شاہنامہ نول کشور ۱۹۰۹ء صفحہ ۳)
بائسنغر مرزا نے اس کا نام محمد لشکری لکھا ہے۔
(دیباچہ بحوالہ شیرانی صفحہ ۳)

---

[1] چہار مقالہ بہاؤن ص ۵۰
[2] شاہنامہ مطبع نولکشور ۱۹۰۹ء ص ۳۲۔ [3] شاہنامہ مطبع نولکشور ۱۹۰۹ء صفحہ ۲۳۶
[4] بعض نسخوں میں یہ مصرعہ یوں ہے۔ سرش سبز بادا و دلش شاد باد
[5] شاہنامہ نول کشور (۱۹۰۹ء) صفحہ ۲۳

بقیہ

شہزادی کلثوم کی اردو شاعری

شہزادی کلثوم کی شاعری کی عمر اُن کی ادبی عمر سے اتنی کم ہے کہ صورت و معنی کے ارتقا کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ غالباً اس شاعری کی عمر صرف پانچ چھ سال ہے۔ یہ صرف ایک اشارہ، ایک ادا اور ایک پیکر ہے۔ یہ پہلا زینہ بھی نہیں کہا جا سکتا، یہ صرف ایک تبسم اور ایک گہرا نقش ہے۔ کلثوم ریاست جموں و کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں اور شاید اس وقت تک آخری بھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انھیں ادبی ماحول، اور ادبی محفلوں اور مشاعروں سے استفادہ کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا۔ "خاتونِ مشرق" اور "عصمت" کی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کی جلدوں میں ان کی نظم و نثر کا کچھ حصہ شائع ہوا ہے اور بس۔

ایک پردہ نشین، تنہائی پسند اور دکھی خاتون کا یہ کلام کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اسے محقق اور ناقد اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کلثوم ایک المیہ کردار کا نام ہے، گھریلو زندگی میں بھی اور ادبی زندگی میں بھی۔ کشمیر کی ایک پردہ نشین عورت نے شاعری اور نثر نگاری کو المیات (Tragedy) سے گریز کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ یہ گریز خود ایک مکمل اشارہ ہے۔ ٹریجڈی کا حسن اور المیہ کا جمال اسی گریز سے ظاہر ہوا ہے۔ عمل پیہم جد و جہد، کشمکش، اعتماد اور حوصلے کی باتیں اسی المیہ شعور (Tragic Consciousness) سے آئی ہیں۔ المیہ شعور جب آرٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کی پہچان وہاں اچھی طرح ہوتی ہے جہاں وہ اہم اخلاقی نکات اور کردار کے جوہر کی دریافت کرتا ہے۔ شہزادی کلثوم کی شاعری میں اس پہلو کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ ہلکے ہلکے تصادم میں بھی المیات کے جمالیاتی جوہر کی چمک نمایاں ہے۔ آرٹ کے سہارے کے بعد المیہ شعور المیات کے خوف (Tragic Fear) سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ شہزادی کلثوم کی شاعری میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں تصادم، عمل پیہم اور اعتماد اور حوصلے سے دلچسپی لیتے ہوئے شاعرہ اس خوف سے بے خبر ہو گئی ہے۔ شہزادی کلثوم نے اس گریز سے اپنے ذہن کو آرٹ کے علاوہ مذہب سے بھی گہرے طور پر وابستہ کر دیا تھا، نثری تخلیقات میں اس گریز کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مجھے فن کار کے گریز کا یہ عمل جتنا رومانی اور ادبی نظر آتا ہے، اتنا "حقیقت نگاری" اور "عکاسی" کا عمل ادبی اور رومانی نظر نہیں آتا۔ مذہب کی گہری رومانیت بھی شہزادی کلثوم کے المیہ کا نفسیاتی سہارا ہے۔ نثری ادب میں بھی بنیادی خیالات وہی ہیں جو شاعری میں ملتے ہیں، آرٹ کی رومانیت نے مذہب کے بعض اہم کرداروں کو مکمل رومانوی کردار بنا دیا ہے، حضرت عبداللہ بن حسن سے کلثوم کی والہانہ عقیدت میں اس رجحان کو دیکھا جا سکتا ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اس رجحان میں جو اضطراب اور خلش، جو چبھن اور درد ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے شاعرہ کے میلانِ فکر کا پتہ چلتا ہے، ایک صاف، پاکیزہ، سنجیدہ، پرخلوص اور شریف کردار کی لمسی کیفیات کا علم ہوتا ہے۔ کلام کی پاکیزگی احساس و فکر کو فریب میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ ہم اس سے ایک بالیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شاعری کا سہارا کلثوم کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا، ماحول کی گھٹن، کم بختی اور ادبی اقدار نے ان کے تجربوں کو پھیلا دیا، تصوریت فکر اور احساس اور ہیجانات نے سنہرے جال بُن دیئے۔ اس طلسمی فضا میں کلثوم نے تلخ تجربوں کو بھی ارتقائی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔

نقطۂ نگاہ کا پردہ ہے ورنہ حُسنِ یار
کب آشکار نہیں تھا جو آشکار کرے
کہو نظر سے بدل دے نظامِ دردِ دل
نہ میری طرح زمانے کو بے قرار کرے

بے کسوں کی آہ بھی وہ آہ پُر تاثیر ہے
آپ تو کیا، آبدیدہ آپ کی تصویر ہے
ہوشیار اے دامنِ عقل و خرد اب ہوشیار!
آج پھر دستِ جنوں میرا گریباں گیر ہے

جس کے دم سے تھی مرے دل کی امنگوں میں بہار
اب وہی خونِ جگر دیدۂ خوں بار میں ہے

کعبے سے روٹھ کے بُت آئے صنم خانے میں
اب کہاں روٹھ کے جائیں گے صنم خانے سے؟
مے کدے سے ترے میخوار کدھر کو آئیں
تو نے کعبے سے پکارا کہ صنم خانے سے؟

سوئے دل جو نگاہ ہوتی ہے بخدا بے پناہ ہوتی ہے

لب و لہجہ کتنا صاف اور شگفتہ ہے، الفاظ کا آہنگ اور صوتی پیکر بھی کلاسیکی مزاج لئے ہوئے ہے، تجربوں کا اظہار بڑی بیباکی سے ہوا ہے، اس قسم کے اشعار ہماری ذہنی اور جذباتی ہمدردی فوراً حاصل کر لیتے ہیں۔ "محبت" "احساسِ زوال" "اپنا ماضی و حال" "صدائے دل" "دوشِ شاہد مجاہد" اور کچھ نوحے اور کچھ سلام اچھی نظمیں ہیں، ابتدائی کوشش کی خامیاں موجود ہیں لیکن کلثوم کے فن کی خوبیاں ان خامیوں پر غور کرنے نہیں دیتیں۔ وادیٔ کشمیر کی پہلی شاعرہ کا اس طرح "استقبال" کرتے ہوئے مجھے مسرت بھی ہے اور میری آنکھیں پُرنم بھی ہیں۔

بقیہ

یوپی کی حکومت کو لسانی پالیسی کے نفاذ کے معاملے میں چوکنا رہنا چاہئے

جہاں تک اسکولوں میں اُردو پڑھانے کے اہتمام سے بحث کرتے ہوئے کمیٹی نے اس انتظام کو پسند کیا کہ اسکولوں میں تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ایک رجسٹر کھول دیا جائے جس میں ایسے طلبہ کے نام لکھے جاتے رہیں جو اسکول میں نام لکھانا چاہتے ہیں اور جن کی زبان اُردو ہے۔ اگر ان کی تعداد مقررہ تعداد کے برابر آجائے تو اُردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کر دی جائے لیکن کمیٹی نے یہ مطالبہ منظور نہیں کیا کہ اُردو بولنے والے طلبہ کی تعداد کا لحاظ کئے بغیر ہی اُردو کی تعلیم کی سہولت فراہم کر دی جائے۔ کمیٹی نے محسوس کیا کہ یہ مطالبہ قابل عمل نہیں ہے اور ان موجودہ ہدایات کو پسند کیا کہ اگر ایسے طلبہ کی تعداد جو اُردو پڑھنا چاہتے ہوں ایک کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس ہوں تو اُردو پڑھانے کا انتظام کر دیا جائے۔

سکنڈری اسکولوں کے لئے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ جن سکنڈری اسکولوں میں ایسے طلبہ کی تعداد "کسی ایک کلاس میں کم سے کم پانچ" ہو وہاں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اُردو کی تعلیم کی سہولت دے دی جائے۔

ابتدائی کتابوں کی زبان: کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ درسی کتابوں کے مضامین اور زبان میں اصلاح کی بڑی گنجائش ہے۔ پہلے درجے سے لے کر پانچویں درجے تک درسی کتابوں کے اسباق کی زبان آسان ہونا چاہئے اور ان میں صرف رسم خط کا فرق ہونا چاہئے۔ کوشش ہونا چاہئے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جنھیں اُردو بولنے والے طالب علم بھی سمجھتے ہوں اور ہندی بولنے والے طالب علم بھی، دیوناگری اور اُردو رسوم خط میں الگ الگ الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش بھی آئے تو آگے بریکٹ میں اُن کے مترادف الفاظ بھی لکھ دئے جائیں۔

کمیٹی نے سفارش کی کہ پہلے درجے سے لے کر پانچویں درجے تک کی کتابوں پر مذکورہ بالا مقصد سے نظرثانی کی جائے اور ان کو پھر سے لکھوایا جائے۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ اُردو کے فضلا کو اس سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کرنے کی دعوت دی جائے۔

کمیٹی نے سفارش کی کہ اُردو کی درسی کتابوں میں مقابل صفحہ پر وہی عبارت ہندی رسم خط میں بھی لکھی ہوئی ہو تاکہ طلبہ دیوناگری رسم خط سے مانوس ہو جائیں اور تیسرے درجے سے آگے انھیں دیوناگری رسم خط سیکھنے میں آسانی ہو۔

کمیٹی نے اس مطالبہ سے اتفاق نہیں کیا کہ سکنڈری اسکولوں میں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کی اجازت دی جائے۔ کمیٹی نے کہا کہ ریاست میں ثانوی درجات کے ذریعے تعلیم کے بارے میں تعلیم کے موجودہ ڈھانچے میں کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ علاقائی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم رہنا چاہئے۔

کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ سکنڈری اسکولوں میں بحیثیت مضمون اُردو کی جو کتابیں ہیں ان پر نظرثانی کی جائے اور ان درسی کتابوں کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب تر لایا جائے۔ یہی اصول ہندی کے لئے بھی لاگو کیا جائے۔

نظم و نسق میں اُردو کے استعمال کا جائزہ لیتے ہوئے کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عدالتوں اور دفتروں میں اُردو رسم خط میں درخواستیں دینے اور کاغذات پیش کرنے کی کافی سہولتیں دی گئی ہیں۔ اور شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ "افسروں اور دفتروں کی بہت بڑی تعداد نے حکومت کے احکامات پر عمل در آمد کیا ہے"۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "اہم قوانین، ضابطوں اور قاعدوں کا خلاصہ شائع کرنے کے بارے میں جو پالیسی متعین کی گئی ہے وہ بظاہر اطمینان بخش ہے لیکن اس بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ آیا مقصد حاصل بھی ہوا ہے۔ حکومت کو خیال رکھنا چاہئے کہ اس سلسلے میں کسی کی جائز شکایت باقی نہ رہے"۔

اس مطالبہ کے بارے میں کہ اُردو میں دی ہوئی درخواست کا جواب بھی اُردو ہی میں ملنا چاہئے۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں سختی سے کوئی قاعدہ مقرر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر بھی یہ کوشش ہونا چاہئے کہ جب کوئی درخواست اُردو رسم خط میں موصول ہو تو اس کا جواب بھی اسی رسم خط میں دیا جائے۔

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ جن اضلاع کے لئے حکومت نے مان لیا ہے کہ نوٹسوں اور قوانین کے اُردو میں شائع ہونے کی سہولت دینا ضروری ہے۔ وہاں کے لوکل بورڈوں کو بھی یہی سہولتیں دینے کی کوشش کرنا چاہئے۔

کمیٹی نے اپنے افتتاحیہ فقروں میں کہا ہے کہ کمیٹی نے جو حل تجویز کئے ہیں وہ عبوری نوعیت کے ہیں۔ "اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ زبان کے دونوں اسالیب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجائیں کہ اُردو بولنے والے لوگ ہندی سمجھ ہی نہیں بول بھی سکیں اور اسی طرح ہندی بولنے والے لوگ اُردو سمجھ اور بول سکیں"۔

(قومی آواز)

قومی ترانہ کا ہندی اُردو اور پنجابی میں ترجمہ

چنڈی گڑھ کی ایک خبر کے مطابق حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ قومی ترانہ کا ترجمہ آسان ہندی اُردو اور پنجابی میں کرا کے اسکولوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسکول کی پڑھائی قومی ترانہ کے گانے کے بعد شروع کی جائے۔

لسانی اقلیتوں کو انکی مادری زبان میں ثانوی تعلیم دی جائے

قومی یکجہتی کی علاقائی کونسلوں کی کمیٹی کی سفارش

بمبئی ۲۰؍اگست۔ قومی یکجہتی کی علاقائی کونسلوں کی کمیٹی نے آج یہاں سفارش کی کہ جن ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کو مادری زبان میں ثانوی تعلیم دینے کی سہولت اب تک بہم نہیں پہنچائی گئی ہے ان ریاستوں کو چاہیے کہ جلد سے جلد لسانی اقلیتوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کا بندوبست کریں۔ یہ کمیٹی مرکزی وزیر داخلہ مسٹر لال بہادر شاستری اور پانچ علاقائی کونسلوں کے نائب چیرمنوں پر مشتمل ہے۔

کمیٹی نے آج یہ بھی اعلان کیا کہ کسی یونیورسٹی میں ذات پات، مذہب و ملت اور جنم بھومی کی بنیاد پر داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کمیٹی نے آج سہ پہر کو چار گھنٹہ تک مختلف اہم مسائل پر غور و خوض کیا اور یہ مشورہ دیا کہ تعلیم گاہوں میں داخلہ کے لئے رہائشی پابندی کو کس طور پر ختم کیا جاسکتا ہے اس کی تحقیقات کے لئے ۵۔ افراد پر مشتمل ایک مطالعہ کمیٹی مقرر کرنی چاہیے۔

کمیٹی نے مختلف ریاستوں میں لسانی اقلیتوں اور دیگر اقلیتوں کے لئے تحفظات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے اس مشورہ کا اعادہ کیا کہ ہندی اور انگریزی کی تعلیم اوائل عمر سے ہی شروع ہو جانی چاہیے۔

گورنر شری سیچر کو اُردو تنظیموں کی جانب سے سپاسنامہ

حیدرآباد۔ ۲۷؍اگست۔ مسٹر بھیم سین سیچر گورنر آندھرا پردیش نے کہا ہے کہ وہ آئندہ جہاں بھی اور جس حال میں بھی رہیں گے آندھرا پردیش کی بساط بھر خدمت کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ مسٹر سیچر کو جن کے عہدہ کی میعاد چند دنوں میں ختم ہو رہی ہے رخصت کرنے کے لئے آج شام اُردو ہال میں اردو کی تین تنظیموں انجمن ترقی اُردو، ادارہ ادبیات اُردو اور اردو مجلس کی جانب ایک وداعی جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ تینوں تنظیموں کی طرف سے مسٹر حبیب الرحمٰن نے ایڈریس کا سکیٹ میں پیش کیا۔ مسٹر بھیم سین سیچر نے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے زبان کے مسئلے کا بھی ذکر کیا اور حکومت آندھرا پردیش نے اس مسئلہ میں جو پالیسی اختیار کی ہے اس کی ستائش کی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت آندھرا پردیش زبان سے متعلق مسائل کو دانشمندانہ طریقہ پر حل کر رہی ہے۔ مسٹر سیچر نے کہا ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ انتہائی نازک دور ہے۔ کچھ لوگوں کو ابھی راستہ صاف صاف نظر نہیں آتا اور منزل کا تصور واضح نہیں ہے۔ ہمیں دور اندیشی اور دانشمندی سے کام لینا ہوگا۔ اُردو کے حامیوں کو چاہیے کہ اس زبان کی سادگی اور مٹھاس کو باقی رکھیں۔ دوسرے اگر کچھ کہتے ہیں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری نہیں۔ آپ اس زبان کی پُرخلوص خدمت کیجئے۔ اس کی شیرینی سب کا دل موہ لے گی۔ زبان ایسی ہونی چاہیے کہ دوسرا سمجھ سکے۔ ایسی زبان بولنے سے خاموش رہنا بہتر ہے جو دوسرے سمجھ نہ سکیں۔ گورنر سیچر نے کہا کہ "اُردو سے ان کی محبت فطری ہے، اُردو ان کے گھر کی زبان ہے، یہ وہ زبان ہے جو انھیں ماں باپ نے پڑھائی اور پنجاب کی سرزمین پر علم و ادب اور تہذیب کا سرچشمہ بنی رہی"۔ انہوں نے کہا کہ "وہ جہاں بھی رہیں گے اُردو کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اس زبان سے اُن کا لگاؤ تادم زیست رہے گا"۔

مسٹر حبیب الرحمٰن نے سپاس نامہ پڑھ کر سُنایا جس میں کہا گیا ہے کہ مسٹر سیچر نے پانچ سال کے عرصے میں آندھرا پردیش والوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرلی۔ آپ عام طور پر ہر اجتماع کو اُردو میں مخاطب کرتے رہے۔ آپ کے اس رجحان کی وجہ سے آپ کے اور سُننے والوں کے درمیان ذہنی ربط اور لگاؤ پیدا ہوگیا۔ اضلاع کے دوروں میں بھی آپ نے اُردو میں تقریریں کیں۔ آپ وقتاً فوقتاً اُردو کے بیمار، ضعیف اور تنگ دست ادیبوں اور شعراء کی امداد کرتے رہے۔ ان تمام باتوں نے آندھرا پردیش کے اُردو بولنے والوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا "دل بدست آور کہ حج اکبر ست" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے آپ نے یہاں کے اُردو بولنے والوں کے دلوں پر اپنی شرافت، مروت، نیک نفسی کے اثرات مرتب کئے ہیں۔ تینوں اداروں کی جانب سے مولوی حبیب الرحمٰن، مولوی سید علی اکبر، رائے جانکی پرشاد اور مسٹر منظور احمد نے گل پوشی کی۔ بانو طاہرہ سعید نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۶؍اگست کو اُردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری سابق صدر شعبۂ اُردو جامعۂ عثمانیہ نے صدارت کی۔ مدرسہ فوقانیہ عالیہ کے استاد جناب ابو محمود نے "اُردو کی مزاحیہ شاعری" کے زیر عنوان اپنا معلومات آفریں اور باغ و بہار مضمون سُنایا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی صدارتی تقریر میں ابو محمود کے مضمون پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے مزاحیہ شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

حضرت امجد حیدرآبادی کا نیا مجموعۂ رباعیات

امجد حیدرآبادی مرحوم کا نیا مجموعۂ رباعیات بیگم امجد نے شائع کیا ہے جس کا نام "حسنِ ملال" ہے۔

یہ مجموعہ اور امجد کی دوسری تصانیف 'امجد اکاڈمی' کے دوم بیرون دبیر پورہ مسجد پیر پادشاہ میں فروخت کے لئے رکھی گئی ہیں۔

معاصرین

کلاسیکی ادب کتب خانوں میں

کالجوں میں اُردو کو خصوصی مضمون لے کر امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن اُردو سے دلچسپی لینے والے طلبہ کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی۔ اُردو کے علاوہ دیگر مضامین میں گریجویشن کرنے والے طلبہ بھی اُردو سے دلچسپی لیتے ہیں اور ناولوں کے علاوہ کلاسیکی ادب پر بھی نظر دوڑانے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ چند ریسرچ اسکالر جب کلاسیکی ادب کی تلاش میں لائبریریوں تک آتے ہیں تو انھیں یہاں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں میں کلاسیکی ادب ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ کالج کی طرف سے ہر شعبہ کو گراں قدر رقم ہر سال ملتی ہے۔ لیکن اس رقم کو ناول اور کہانیاں خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے اور اس رقم کا جائز استعمال نہیں ہوتا۔ اس میں ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ کلاسیکی کتابیں بازار میں دستیاب نہیں ہوتی ہیں یا ان پر کمیشن نہیں دیا جاتا۔ یا وہ اصل رقم سے زائد پر فروخت ہوتی ہیں اور کوئی اس قربانی کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ حالانکہ جب تک قربانیاں نہ ہوں ادب کے اس ضروری باب کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکانات کم ہیں۔

اگر سرکاری طور پر کلاسیکی کتابیں خرید کر کم از کم سرکاری لائبریریوں میں رکھ دی جائیں تو سال میں کم از کم ایک عظیم ادبی سرمائے کا ہر لائبریری میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کی کتابوں کی جستجو کرنے والے، طلبہ کی پیاس بجھ سکتی ہے۔ ملک میں سیکڑوں کالج ہیں اور ان کالجوں میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر ہر کالج، ہر سال کم از کم ایک کلاسیکی جواہر پارے کو اپنی لائبریری میں جگہ دے تو اس نیک مہم میں کافی جان ڈالی جا سکتی ہے۔ ملک میں ہزاروں ہائی اسکول موجود ہیں۔ ان ہائی اسکولوں کی لائبریریوں کو بھی اگر کلاسیکی کتابیں دی جائیں تو ہر سال دو چار ایڈیشن کلاسیکی کتابوں کے بازار میں ہاتھوں ہاتھ نکل سکتے ہیں۔ ان کتابوں کو خرید کر صرف لائبریریوں کی زینت بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے کا شوق عوام میں پیدا کیا جائے۔ عوام میں یہ ذوق صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ ان تصانیف کو اچھے ڈھنگ سے پیش کر کے اس میں دلچسپی پیدا کی جائے اور اس میں دلچسپی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ موجودہ دور کے اچھے مصنف اور ادیب اس کام میں دلچسپی لیں اور اسے بہتر سے بہتر ڈھنگ سے پیش کریں۔ تاکہ عام لوگوں کی بھی دلچسپی برقرار رہے اور ہر قسم کے لوگوں میں کلاسیکی ادب کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو۔ صرف غالب یا میر کے دیوان آرٹ پیپر پہ چھاپنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ نسیم، صہبا، درد، میر، نظیر، آتش، آشفتہ۔ ان شعرا کے مجموعے، میرامن، مرزا رسوا، مولوی نذیر احمد کی تصانیف کو بھی منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ اگر ہمارے پبلشروں کو یہ خطرہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں شائع کرنے سے وہ خطرے میں گھر جاتے ہیں۔ تو وہ کم از کم ان جواہر پاروں کا نچوڑ یا انتخاب شائع کر سکتے ہیں۔ تاکہ یہ عظیم سرمایہ تباہ ہونے سے بچ جائے اور ہمارے بزرگوں کا نام ادب کے ساتھ زندہ رہ سکے۔

(صبح امید۔ بمبئی)

آسان ہندی کیا ہے؟

یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس دیش کی راشٹر بھاشا وہ ہوگی جو دیش کے سادھارن لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔ وہ نہیں جسے تھوڑے سے پنڈت، مولوی یا وِدوان ہی سمجھ پائیں اور جو دوسروں کے لئے پردیسی بھاشا سی بنی رہے۔ کچھ مثالیں دیکھئے میونسپل کمیٹی کے پریسیڈنٹ کو اگر ہم "نگر سبھا کا پردھان" کہیں تو یہ آسان سیدھی سی بات ہے لیکن اگر ہم ایسا کہنے کے بجائے اس کو "نگم ادھیکش" یا صدر "بلدیہ" کہیں تو یہ دونوں کٹھن ہیں۔ "ریڈیو" کو "ریڈیو" کہیں تو ہر آدمی سمجھے گا۔ "آکاش وانی" یا "صوت السماء" کہنے لگیں تو یہ کٹھن ہو جائے گا۔ ریل گاڑی کو "ریل گاڑی" کہیں تو ہر آدمی کو آسانی ہوگی۔ "واشپ یَنتر" یا "لوہ پتھ گامنی" کہنا شروع کر دیں گے تو لاکھوں لوگ جو ہر روز ریل میں چڑھتے ہیں وہ بھی سمجھ نہیں پائیں گے کہ یہ نئی چیز کیا ہے؟ "زمین و آسمان" کو اگر ہم "دھرتی اور آکاش" کہیں تو یہ آسان سی بات ہے۔ "ارض و سما" یا "دھرا ادیو" کہنا شروع کر دیں تو یہ بہت سے لوگوں کے لئے کٹھن ہو جائے گا۔ "ٹیلی فون" کو "ٹیلی فون" کہیں تو ہر آدمی اسے سمجھے گا کیونکہ ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی اسے ٹیلی فون کہتا ہے لیکن اگر اسے "دور بھاش" اور "صوت الفاصلہ" کہنا شروع کر دیں تو ۹۹ فی صدی لوگوں کو معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کہتے کیا ہیں؟ آسان ہندی کا سیدھا سا مطلب ایسی بھاشا ہے جسے لوگ بولتے ہیں اور آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس بھاشا میں اگر پہلے سے سنسکرت فارسی، عربی، انگریزی یا کسی دوسری بھاشا کے شبد موجود ہیں تو انھیں جوں کا توں رہنے دینا چاہیے۔ اگر تکنیکی ضرورت کے لئے نئے شبدوں کو بھاشا میں لانا ہو تو جتن ہونا چاہیے کہ ان شبدوں کو ایسا روپ دیا جائے جسے سمجھنا لوگوں کے لئے کٹھن نہ ہو۔ شری کھیر کے زمانے میں یہ غلطی ہوئی کہ ہندی میں بہت زیادہ سنسکرت کے شبد بھر دئے گئے۔ اب اگر شری گوپال ریڈی کے زمانے میں ہندی میں عربی اور فارسی کے شبدوں کی بھرمار کی گئی تو یہ بات اتنی ہی غلط ہوگی جتنی پہلے تھی۔　(ملاپ۔ نئی دہلی)

ضروری اعلان:- براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

ڈاکٹر محمد حسن

تبصرے

اُردو رسم الخط کی تجدید

مصنف محمد احسن اللہ

ضخامت ۳۲ صفحات - قیمت درج نہیں

مطبوعہ مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

اُردو رسم خط کی اصلاح یا اس میں تبدیلی پیدا کرنے کا سوال ایک مدت سے اُردو دانوں کے پیش نظر رہا ہے۔ اس مختصر سے رسالے میں مصنف نے نہایت وضاحت کے ساتھ مدلل انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو رسم خط میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کو دور کرنے کے لیے انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مثلاً اس کے حروف کے اجزا کسی خاص سمت میں تحریر نہیں کیے جاتے بلکہ مختلف سمتوں میں پھیلتے جاتے ہیں یا چند حروف ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے حروف کا آپس میں الحاق ممکن نہیں یا اس رسم خط میں بالائی انداز ہے اور قوسی انداز بالکل نہیں ہے۔ آخر میں مصنف نے رومن رسم خط کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ رسالہ یقیناً خیال انگیز ہے اور ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

تنقیدی شعور

مصنف: اختر تلہری

ضخامت: ۲۰۰ صفحات قیمت ۲٫۷۵ روپے

مطبوعہ: کتاب نگر دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

یہ اختر تلہری کے بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے یہ سب مضامین یادش بخیر اس زمانے کی یادگار ہیں جب ترقی پسندی اور اشتراکیت دشمنی اپنے شباب پر تھی۔ اختر تلہری صاحب اچھا ادبی مذاق رکھتے ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین کی زبان اور بیان رواں اور شستہ ہے مگر کاش کہ یہ ان کا سارا زور بیان منفی لب و لہجے میں صرف نہ ہوتا اور وہ کم سے کم قدما کے مطالعے خود اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتے۔ اس مجموعے میں زیادہ زور ترقی پسند نقادوں کی تنقید پر ہے مثلاً مجنوں گورکھپوری کے "تنقیدی حاشیات" اور "ادب اور زندگی" دو مضامین ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کے خیالات پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اختر تلہری ہمارے بعض بزرگوں کی طرح نئے زمانے کے ادبی مذاق کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں اور اسی لئے "طرز کہن پر اڑنا" ہی ان کے ہاں سب کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ مجموعی طور پر ان مقالات میں گرما گرمی زیادہ ہے اور روشنی کم لیکن کشمکش سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مسئلے کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس مجموعے میں تین مضامین ایسے ہیں جو اعتراض کے طور پر اختر صاحب کا ان پر ہیں لکھے گئے ہیں لیکن یہ مضامین تشنہ رہ گئے ہیں۔

دار و رسن کی آزمائش

تصنیف: نکولائی آستراوسکی

ضخامت: ۱۰۸ صفحات - قیمت درج نہیں

مطبوعہ: پردیسی زبانوں کا اشاعت گھر ماسکو

نکولائی آستراوسکی روس کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۹۰۴ء تا ۱۹۳۶ء روس میں زبردست سیاسی اور فکری انقلابات کا زمانہ تھا اور سماجی کومسومول کے رہنما کی حیثیت سے اور پھر ۱۹۱۹ء میں سُرخ فوج میں شامل ہو کر اس نے انقلاب میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر وہ زندگی بھر کے لئے اپاہج ہو گیا اور اس کی بصارت بھی جاتی رہی لیکن اس نے ۱۹۳۲ء میں اپنی زندگی کی داستان کو اپنے پہلے ناول کی شکل میں لکھا اس میں ایک جواں سال مجاہد کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے مثالی قرار دیا جا سکے۔ اس ناول پر اسے "آرڈر آف لینن" دیا گیا۔ ترجمہ شستہ اور رواں ہے یہ کتاب خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ شروع میں مصنف اور اس ناول پر ایک تعارفی نوٹ بھی شامل ہے۔

ہیلینا

تصنیف: گوئٹے - ترجمہ فضل الرحمن

ضخامت: ۸۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ

مطبوعہ: سب رس کتاب گھر، ادارۂ ادبیات اُردو،
خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

یہ قصّہ دراصل گوئٹے کے شہرۂ آفاق کارنامے فاؤسٹ کا ایک حصّہ ہے جسے انگریزی ترجمے سے فضل الرحمن صاحب نے اُردو نظم میں منتقل کیا ہے۔ فاؤسٹ کے تقاضے پر شیطان ہیلن کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں واپس لے آتا ہے اور قصّہ وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہزاروں سال قبل اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔" ہیلن دراصل یونانی تہذیب و تمدن اور آرٹ کی جیتی جاگتی علامت ہے اور فاؤسٹ کی محبت یورپ کے نشاۃ ثانیہ کا مظہر اور یوفورین ان دونوں کے کامیاب عشق کا ثمر۔ اس لڑکے کا کردار (اس معدی) جدید جوشیلی شاعری کا مظہر ہے" منظوم ترجمہ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ فضل الرحمن صاحب کا منظوم ترجمہ بہت کچھ شاعرانہ اور رواں ہے۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا